عربی اور اسلامیات کے ایم اے میں داخلہ لینے کے اھل ھیں ۔ یہ ستم ظریفی ھمارے تعلیمی نظام میں ایک مدت دراز تک روا رکھی گئی ۔ اگر یہ موجودہ تبدیلی انداز فکر میں صحتمند مثبت تبدیلی کا نتیجہ ہے تو ھمارا مشورہ ہے کہ جرأت سے کام لیکر ایک قدم اور آگے بڑھائیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں سے ان مضامین میں سند فراغت حاصل کرنے والے ایم ایز اور پی ایچ ڈیز کو درس و تدریس کی ذمہ داریاں سونپنے یا کوئی علمی اور تحقیقی کام تفویض کرنے سے پہلے ان پر لازم کیا جائے کہ وہ دینی مدارس کے امتحانات پاس کریں ۔ اور جب تک وہ یہ مرحلہ کامیابی کے ساتھ نہ طے کر لیں انہیں عملی میدان میں قدم رکھنے کی اجازت نہ دی جائے ۔ ان خاص مضامین کی حد تک علمی اور تعلیمی اداروں میں معیار کی یکسانیت قائم کرنے کے لئے یہ انتہائی ضروری ہے اس لئے کہ ان مضامین میں ان دو تعلیمی نظاموں سے آئے ہوئے اساتذہ کے علمی اور تعلیمی معیار مین اتنا بُعد اور تفاوت ہوتا ہے کہ کسی طور ان کو ایک سطح پر نہیں لایا جا سکتا ۔

اس سلسلے میں دینی مدارس کی درجہ بندی بھی ضروری ہے ۔ باقاعدہ معائنہ اور تحقیق کے بعد ان مدارس کا مرتبہ متعین کئے بغیر آنکھ بند کرکے محض ان کی سندوں پر انحصار کیا گیا تو بھی اندیشہ ضرر سے خالی نہیں ۔ ھر دینی مدرسہ اس کا اھل نہیں ھو سکتا کہ اس کے سند یافتہ کو ایم اے تصور کیا جائے ۔ نصاب ، مدت درس اور معیار تعلیم کو دیکھے بغیر کسی مدرسے کو یہ حق نہ دیا جائے ورنہ اس سے بھی اسی طرح غلط بخشی اور نقصان کا خطرہ ہے ۔ ھمارے مدارس کا مزاج بھی اشتہاری ھو گیا ہے ۔ موجودہ دور میں کسی مسجد کے ایک حجرے پر جامعہ فلاں کا بورڈ آویزاں نظر آنا کوئی غیر ممکن بات نہیں رھی ۔

حکومت نے یہ فیصلہ کرکے صحیح سمت میں ایک صحیح قدم اٹھایا ہے ۔ امید ہے کہ اس کے اچھے نتائج نکلیں گے بشرطیکہ صحیح طریقے پر اس کا نفاذ ھوا ۔

(مدیر)

Fikr-o-Nasar (Islamabad) 19:1 (1981)

نفع و نقصان میں شرکت کا معاملہ اور اس کی شرعی حیثیت

محمد طاسین

بلا سود بنکاری پر اسلامی نظریاتی کونسل کی جو رپورٹ شائع ہوئی ہے اس کے متعلق خود کونسل کے ایک رکن مولانا محمد تقی عثمانی نے اپنے ایک مضمون میں جو متعدد رسائل و اخبارات میں شائع ہو چکا ہے لکھا ہے :

"آخر میں ہم ملک کے ان علماء سے جو خاص طور پر فقہ میں بصیرت رکھتے ہیں یہ گزارش کرتے ہیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے جو رپورٹ غیر سودی بنکاری کے سلسلہ میں شائع کی ہے اس کا بنظر غائر مطالعہ فرما کر اس کا شرعی نقطہ نظر سے جائزہ لیں ، ظاہر ہے کہ یہ رپورٹ اس معاملے میں حرف آخر نہیں ہے اس میں اب بھی علمی و فقہی خامیاں ہو سکتی ہیں ۔ ۔ ۔ اس لئے یہ علماء کا فریضہ ہے کہ اس کا جائزہ لے کر ضروری ہو تو اس میں اصلاحات تجویز فرمائیں "

کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر تنزیل الرحمن نے از راہ کرم رپورٹ کی ایک کاپی مجھے بھی عنائت فرمائی لہذا مجھے اس کا بغور مطالعہ کرنے اور اس کے مندرجات و مشتملات کا شرعی نقطہ نظر سے تحقیقی جائزہ لینے کا موقع ملا ۔ اس سے جو باتیں میرے علم میں آئیں اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے پیش نظر دینی و ملّی فریضہ سمجھا کہ اُن کو تحریری شکل میں پیش کر دیا جائے ۔

اس مضمون میں میرا مقصد اُن تمام امور و معاملات کے تفصیلی بحث کرنا نہیں جو ماہرین اقتصادیات کے پینل نے اس رپورٹ میں سود کے متبادل

تجویز فرمائے ہیں اور جن میں سے کچھ کو خود کونسل کے علماء نے بھی مستحسن و پسندیدہ نہیں قرار دیا ، بلکہ میرا مقصد ایک معاملہ کے متعلق تفصیلی اور باقی معاملات کے بارے میں اجمالی طور پر کچھ عرض کرنا ہے ، اس ایک معاملہ سے میری مراد نفع و نقصان میں شراکت کا معاملہ ہے جس کو سود کا نعم البدل اور ایک مثالی معاملہ کہا گیا اور جو اس رپورٹ میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے ۔

اس رپورٹ میں نفع و نقصان میں شراکت کے معاملہ کو جس شکل میں پیش کیا گیا ہے اُس شکل کے لحاظ سے یہ معاملہ اپنی قسم کا ایک انوکھا معاملہ ہے جس کا گزشتہ چودہ سو سال کے فقہی لٹریچر میں کہیں نام و نشان نہیں ملتا ۔

اس معاملے کو میں نے اپنی قسم کا انوکھا معاملہ اسلئے کہا ہے کہ یہ اپنی بناوٹ و ساخت اور ماہیت و حقیقت کے اعتبار سے نہ مضاربت کا معاملہ ہے اور نہ شرکت کا معاملہ جن کا کہ قرآن ، حدیث اور فقہ میں ذکر ہے اور جن کی شرعی حیثیت معلوم اور متعین ہے ، مضاربت کا معاملہ یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس میں کام کرنے والے فریق کو نقصان میں بھی شریک ٹھہرایا گیا ہے جبکہ مضاربت میں کام کرنے والا فریق مالی نقصان میں بالکل شریک نہیں ہوتا بلکہ مالی نقصان سب کا سب سرمائے والے فریق کو برداشت کرنا پڑتا ہے ، اور شراکت کا معاملہ یہ اس وجہ سے نہیں کہ اس میں ایک فریق کا صرف سرمایہ ہے جو بنک میں شراکتی کھاتہ کھولتا ہے اس کے ساتھ اس کا کوئی تجارتی یا صنعتی کام و عمل نہیں حالانکہ شرکت کی ہر قسم میں ہر شریک کا سرمائے ، وجاہت اور ہنر کے ساتھ کام و عمل میں شریک ہونا بھی ضروری ہے ، نیز مضاربت اور شرکت دونوں میں یہ ضروری ہے کہ معاملہ شروع کرتے وقت نہایت واضح الفاظ میں یہ تعین ہو کہ فریقین کے مابین نفع کس نسبت سے تقسیم ہوگا اور یہ تعین خود فریقین اپنی آزاد مرضی سے کریں تیسرا کوئی ان پر اپنی مرضی مسلط نہ کرے خواہ وہ حکومت کا کوئی ادارہ ہی کیوں نہ ہو ، جبکہ شراکت کے زیر بحث معاملہ میں کھاتہ دار اور بنک کے

درمیان ایسا کوئی تعین ضروری نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ بنک پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے منافع تقسیم کرے ۔ اسی طرح بنک اور کاروباری اداروں کے درمیان نفع کی تقسیم کے تعین کا اختیار اسٹیٹ بنک کو دیا گیا ہے ۔ نیز یہ اس وجہ سے بھی مضاربت کا معاملہ نہیں کہ اس میں شراکتی کھاتے کے مال کو وہ تحفظات دیئے گئے ہیں جو قرض کے مال کے لئے ہوتے ہیں جبکہ مضاربت کا مال کام کرنے والے فریق کے پاس بطور امانت ہوتا ہے اور اس کی حیثیت قرض کے مال کی نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ اگر غیر اختیاری طور پر وہ ضائع ہو جائے تو کام کرنے والے فریق پر اس کا تاوان نہیں آتا ۔ ایک اور وجہ زیر بحث معاملے کے مضاربت نہ ہونے کی یہ بھی ہے کہ اس میں ایک فریق یعنی بنک کا ادارہ ، اپنے شراکتی کھاتے دار کو یہ یقین دلاتا ہے کہ اسے نہ صرف یہ کہ نفع ضرور ملے گا بلکہ موجودہ شرح سود سے زیادہ ملے گا جبکہ مضاربت میں نفع کا احتمال تو ہوتا ہے لیکن یقین نہیں ہوتا ورنہ اُس میں اور معاملہ ربا میں زیادہ فرق باقی نہیں رہتا ۔ ایک اور وجہ جس کی بنا پر زیر بحث معاملہ، معاملۂ مضاربت نہیں یہ کہ اس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ بنک سال میں دو مرتبہ اس کا منافع تقسیم کرے گا یعنی دوران معاملہ منافع کی تقسیم ہوتی رہے گی جبکہ مضاربت میں منافع کی تقسیم صرف اس وقت ہو سکتی ہے جب معاملہ اختتام کو پہنچ جائے اس سے پہلے نہیں ہو سکتی ۔ ایک اور پہلو سے بھی یہ معاملہ مضاربت کے معاملہ سے مختلف ہے اور وہ یہ کہ بعض ائمہ مجتہدین کے نزدیک مضاربت کا سرمایہ صرف تاجر کو خرید و فروخت کے کام کے لئے دیا جا سکتا ہے ہنر مند صانع کو صنعت و حرفت کے لئے نہیں دیا جا سکتا جبکہ زیر بحث معاملے میں یہ بھی طے ہے کہ اس کا سرمایہ صنعت و حرفت میں بھی لگایا جائے گا ۔ غرضیکہ متعدد وجوہ ہیں جن کی بنا پر زیر بحث معاملہ ، مضاربت کا معاملہ نہیں ۔

اور شرکت کا معاملہ نہ ہونے کی وجہ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا یہ ہے کہ شرکت کے معاملہ میں سرمایہ وغیرہ کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر فریق کا تجارتی یا صنعتی کام و عمل بھی ہو ، اور چونکہ زیر بحث

معاملہ میں ایک فریق کا جو بنک میں شراکتی کھاتہ کھولتا ہے سرے سے کوئی تجارتی کام و عمل نہیں لہذا یہ معاملہ ، شرکت کی کسی قسم میں نہیں آتا۔ فقہاء احناف نے معاملہ شرکت کی تین قسمیں بیان کی ہیں : شرکۃ الأموال ، شرکۃ الوجوہ اور شرکۃ الابدان جسے شرکت اعمال اور شرکت صنائع وغیرہ بھی کہا جاتا ہے ، اور پھر ان تینوں قسموں کی جو تعریفیں لکھی ہیں وہ یہ کہ (۱) شرکت اموال وہ معاملہ ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ تجارت پیشہ افراد آپس میں یہ طے کرتے ہیں کہ وہ اپنا سرمایۂ یکجا کرکے مل جل کر تجارتی کام کریں گے اور نفع و نقصان میں شریک رہیں گے (۲) شرکت وجوہ وہ معاملہ ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ ایسے اشخاص جن کے پاس تجارت کے لئے اپنا سرمایہ نہیں ہوتا لیکن ہر ایک باوجاہت اور صاحب اعتبار اور قابل اعتماد ہوتا ہے جسے لوگ اُدھار مال دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے ، آپس میں یہ طے کرتے ہیں کہ اپنی وجاہت اور ساکھ استعمال کرکے اُدھار مال خرید کر بیچیں گے اور نفع و نقصان میں شریک اور حصہ دار رہیں گے۔ (۳) شرکت ابدان یا شرکت صنائع و اعمال وہ معاملہ ہے جس میں دو یا دو سے زائد اَرباب ہنر و پیشہ جیسے دو بڑھئی یا دو لوہار یا دو درزی ، یا ڈاکٹر و انجینئر وغیرہ آپس میں یہ طے کرتے ہیں کہ اپنے ہنر و پیشے کا کام مل جل کر کریں گے اور نفع و نقصان میں شریک رہیں گے۔ اور پھر ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں اگر تمام امور میں مساوات و برابری ہو تو شرکت مفاوضہ ، اور کمی بیشی اور تفاوت ہو تو شرکت عنان ہے۔ بہر حال عقد شرکت کی جو بھی قسم اور شکل ہو اس کی تعریف سے بدیہی طور پر ظاہر ہے کہ اُس میں منجملہ دوسری چیزوں کے سب شرکاء کا کام و عمل بھی ضروری ہے ، گویا یہ چیز معاملہ شرکت کی حقیقت میں داخل اور اس کی ماہیت کا جزولاینفک ہے لہذا یہ خیال کہ معاملہ شرکت ایک فریق کے عمل کے بغیر بھی ہو سکتا ہے بدیہی طور پر غلط ہے۔

قرآن حکیم کی جن آیات اور رسول کریم ﷺ کی جن احادیث سے معاملہ شرکت کا جواز ثابت ہوتا ہے ان سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ معاملہ

شرکت کے اندر سب شرکاء کا عمل بھی ایک ضروری چیز ہے ۔ مثلاً سورۃ الکھف کی آیت ہے :

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ

لیکن وہ کشتی پس وہ چند مساکین کی مشترک ملکیت تھی جو باھمی اشتراک کے ساتھ مل جل کر دریا میں کام کرتے تھے ۔

اس قرآنی آیت میں يَعْمَلُونَ کا لفظ صاف بتلاتا ہے کہ کشتی کے مالک سب شرکاء کام و عمل کرتے تھے یعنی کشتی رانی کا کام ۔ شرکت کے جواز سے متعلق دوسری آیات سورۃ القلم کی وہ آیات ہیں جن میں باغ و کھیت والوں کا ذکر ہے ۔ اُن آیات کے اندر لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ ۔ اور اَنِ اغْدُوا عَلَى حَرْثِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَارِمِينَ کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ھیں کہ باغ اور کھیت کے مالک جملہ شرکاء مل جُل کر اشتراک کے ساتھ کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے ، ایک اور آیت جو شرکت کے جواز میں پیش کی جاتی ہے سورہ ص کی یہ آیت ہے :

إِنَّ كَثِيراً مِنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ

بلا شبہہ بہت سے مل جل کر کام کرنے والے بعض دوسرے بعض پر ظلم و زیادتی کرتے ھیں ۔

اس آیت میں لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ھیں کہ شرکاء میں سے ہر ایک ظلم و زیادتی کا مرتکب ہو سکتا ہے اور یہ چونکہ اُسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ہر ایک کام و عمل کر رہا ہو لہذا مذکورہ الفاظ سے معاملۂ شرکت میں ہر شریک کا عمل پایا جانا ظاہر ہوتا ہے ۔

یہی چیز اُن احادیث نبویہ سے بھی ثابت ہوتی ہے جو معاملہ شرکت کے جواز میں پیش کی جاتی ھیں ، مثلاً اس حدیث کو لیجئے :

عن ابی ہریرۃؓ ان النبی ﷺ قال ان اللہ یقول انا ثالث الشریکین ما لم یخن احدھما صاحبہ فاذا خانہ خرجت من بینہما سنن ابی داؤد

حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : اللہ تعالی فرماتے ھیں کہ میں دو شریکوں کا تیسرا ہوتا ہوں جب تک اُن میں ایک دوسرے کی خیانت نہیں کرتا ، چنانچہ جب ان میں سے

ایک خیانت کرتا ہے تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں۔
چونکہ معاملے کے شرکاء میں سے ہر ایک دوسرے کی خیانت اسی صورت میں کر سکتا ہے جب ہر ایک عمل اور تصرف میں شریک ہو لہذا اس سے معاملۂ شرکت میں ہر شریک کا عمل بھی پایا جانا ثابت ہوتا ہے۔

بہر حال یہ حقیقت ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ معاملہ شرکت میں مال ، وجاہیت اور ہنر کے ساتھ ہر شریک کا تجارتی یا صنعتی عمل بھی ایک ضروری چیز ہے ، اور دراصل یہی چیز شرکت کو مضاربت سے الگ کر دیتی ہے جس میں صرف ایک فریق کا تجارتی عمل ہوتا ہے اور دوسرے کا صرف سرمایہ ، اور میں سمجھتا ہوں اسی کی وجہ سے معاملۂ شرکت بغیر کسی کراہت اور بالاتفاق جائز ہے اور اس کا جواز عقل و قیاس کے عین مطابق ہے۔

پھر جب یہ زیر بحث معاملہ نہ مضاربت کا معاملہ ہے اور نہ شرکت کا معاملہ تو ظاہر ہے کہ اس کے جواز کے لئے وہ دلائل مفید و کارآمد نہیں ہو سکتے جو قرآن و حدیث میں مضاربت اور شرکت کے جواز سے تعلق رکھتے ہیں لہذا جو حضرات اس معاملے کو اسلامی کہتے ہیں ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اُن کے پاس اس معاملہ کے جواز کے لئے قرآن وحدیث سے کیا دلائل ہیں ، کیونکہ کسی معاملہ کو اسلامی یا غیر اسلامی یا شرعاً جائز و ناجائز کہنا اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب اُس کے لئے کتاب و سنت میں ثبوت موجود ہو اس لئے کہ احکام شریعت کا اصل منبع و سرچشمہ کتاب و سنت اور قرآن و حدیث ہے ، جہاں تک فقہ کا تعلق ہے وہ بھی گو کتاب و سنت سے ماخوذ ہے لیکن اس میں اجتہادی مسائل کے بارے میں فقہاء کے جو مختلف اقوال ہیں نہ تو سب کے سب صحیح ہیں اور نہ سب کے سب غلط بلکہ ان میں بعض صحیح ہیں اور بعض غیر صحیح ہیں کیونکہ مجتہد کی اجتہادی رائے صواب بھی ہو سکتی ہے اور خطا بھی ، لہذا کسی فقیہ کا ایسا قول جس کی اصل اور سند کتاب و سنت میں موجود نہ ہو اسلامی نہیں کہلا سکتا ، بنا بریں ضروری ہے کہ زیر بحث معاملہ کے جواز کے لئے جو دلائل پیش فرمائے جائیں وہ اجمالی یا تفصیلی قرآن و

حدیث سے ضرور تعلق رکھتے ہوں کسی فقیہ کا قول پیش کیا جائے اس کے ساتھ قرآن و حدیث کی وہ نص ضرور نقل کی جائے جس سے اُس فقیہ نے وہ قول نکالا اور مستنبط کیا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ قیاس واستنباط صحیح ہے یا صحیح نہیں ، کیا یہ واقعہ نہیں کہ حنفی فقہاء نے امام مالک ، امام شافعی اور امام احمد کے کتنے اقوال کو یہ کہہ کر رد کیا ہے کہ وہ دلیل کے لحاظ سے کمزور ہیں اور جس استدلال پر وہ مبنی ہیں صحیح نہیں ، اسی طرح خود حضرت امام ابو حنیفہؒ کے کتنے اقوال کو چھوڑا اور صاحبینؒ کے اقوال کو یہ کہہ کر اختیار کیا کہ دلائل کے لحاظ سے یہ زیادہ وزنی اور قابل اعتماد ہیں۔ تو پھر بعد کے فقہاء میں ایسا کون ہے جس کی رائے اور بات کو بلا دلیل مان لیا جائے اور یہ نہ دیکھا جائے کہ وہ قرآن و حدیث کے مطابق ہے یا نہیں ؟

غرضیکہ اگر معاملہ زیر بحث کے متعلق ہمارا یہ دعوی ہے کہ یہ شریعت اسلامی کی رُو سے جائز اور اسلامی معاملہ ہے تو ہمیں اس کا ثبوت قرآن و حدیث سے ضرور بتلانا ہوگا ۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن و حدیث میں ہر ہر جزوی مسئلہ کے متعلق الگ الگ جُزوی و تفصیلی احکام موجود نہیں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اُن کے اندر ایسے اصول کلیہ اور مبادیٔ عامہ بھی موجود نہ ہوں جن میں تمام جزوی مسائل کے لئے اجمالی ہدائت پائی جایا کرتی ہے ، لہذا ضروری ہے کہ قرآن و حدیث میں معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز سے متعلق جو اصل کلی مبدأ عام ہے اس کی رو سے معاملہ زیر بحث کو جائز ثابت کیا جائے کیونکہ کسی ایسے جزوی مسئلہ کے لئے جس کا قرآن و حدیث میں صراحۃً ذکر نہیں شرعی حکم معلوم کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ اصول و مبادی کی روشنی میں قیاس و اجتہاد کے ذریعے معلوم و متعین کیا جائے ۔

یہاں یہ عرض کر دینا نہایت ضروری ہے کہ رپورٹ مذکور کے صفحہ سترہ پر زیر بحث معاملہ کے جواز میں بطور دلیل و حجت سورۃ النساء کی جو آیت پیش کی گئی ہے اس سے نہ صرف یہ کہ اس معاملے کا جواز ثابت نہیں ہوتا بلکہ الٹا عدم جواز نکلتا ہے ، وہ آیت یہ ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَاتَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۔ آیت ۲۹

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ لیکن تجارت ہو جو باھمی رضامندی سے ہو تو مضائقہ نہیں۔

اس ترجمے کے ساتھ رپورٹ میں جو تفسیری نوٹ لکھا ہے وہ یہ کہ آیت واضح طور سے بتلاتی ہے کہ کسی کا مال ناجائز طریقے جیسے سود قمار دھوکا سے ہتیانا حرام ہے، اس کے برعکس باھمی رضامندی اور منصفانہ معاملے کے ذریعے ایک دوسرے کے مال و دولت سے فائد حاصل کرنا جائز ہے۔

مطلب یہ کہ چونکہ نفع و نقصان میں شرکت کا معاملہ باھمی رضامندی سے اور منصفانہ ہے لہذا اس آیت کی رو سے جائز ہے۔

اس قرآنی آیت سے معاملۂ مذکور کا جواز ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟ اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس آیت کی وہ تفسیر سامنے ہو جو کثیر التعداد مفسرین نے اپنی عربی اُردو تفاسیر میں لکھی ہے۔

مفسرین حضرات نے لکھا ہے کہ اس آیت کے پہلے حصہ میں مسلمانوں کو ایسے تمام طریقوں کے ذریعے ایک دوسرے کا مال لینے سے روکا اور منع کیا گیا ہے جو باطل کی تعریف میں آتے ہیں خواہ وہ معاملات ہوں یا غیر معاملات، اور دوسرے حصہ میں صرف ایسی تجارت کے ذریعے ایک دوسرے کا مال لینے کی اجازت دی گئی ہے جو فریقین کی باھمی رضامندی سے ہو۔

تجارت کے معنے بعض مفسرین کے نزدیک معاملہ بیع و شراء اور خرید و فروخت کے ہیں، اور بعض کے نزدیک بیع و شراء اور محنت و مزدوری دونوں کے ہیں گویا نفع کمانے کی غرض سے بیع و شراء اور خرید و فروخت کا کام بھی تجارت ہے اور معاوضے کی خاطر محنت و مزدوری کا کام و عمل بھی تجارت ہے۔ تجارت کے اس دوسرے معنے و مطلب کو ترجیح دیتے اور اختیار کرتے ہوئے مفتی محمد شفیع صاحب، معارف القرآن میں لکھتے ہیں:

"مضمون آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ کسی کا مال ناحق کھانا حرام ہے لیکن رضامندی کے ساتھ بیع و شراء یا ملازمت و مزدوری کا معاملہ ہو جائے تو

اس طرح دوسرے کا مال حاصل کرنا اور اس میں مالکانہ تصرفات کرنا جائز ہے"
ص ۳۷۷ - ج ۲ -

بہر حال تجارت کے معنے صرف خرید و فروخت کے معاملہ کے ہوں یا اس کے ساتھ ساتھ محنت و مزدوری کے معاملہ کے بھی ہوں صاف ظاہر ہے کہ معاملہ زیر بحث تجارت کی تعریف میں نہیں آتا کیونکہ شراکتی کھاتے والا فریق نہ بیع و شراء اور خرید و فروخت کا کام کرتا ہے اور نہ محنت و مزدوری کا کام ، لہذا اس آیت سے اس کا جواز ثابت نہیں ہو سکتا اور یہ آیت کسی طرح اس کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتی ، بلکہ تجزیہ کرکے غور سے دیکھا جائے تو الٹا یہ معاملہ اُن معاملات کی فہرست میں نظر آتا ہے جو باطل کا مصداق ہیں اور جن سے آیت کے پہلے حصہ میں منع کیا گیا ہے ، وُہ اس طرح کہ متعدد مفسرین نے باطل کی تفسیر بغیر حق ، بدون مقابل اور بغیر عوض کی ہے ، اور بعض نے حضرت عبد اللہؓ بن عباسؓ اور حضرت حسن بصری کے حوالے سے باطل کی یہ تعریف نقل کی ہے : "الباطل ھو کل مایُوخذ من الانسان بغیر عوض" - باطل ہر وہ مال ہے جو کسی انسان سے بغیر عوض کے لیا جائے - تفسیر المنار میں لکھا ہے : "اما الباطل ما لم یکن فی مقابلة شیء حقیقی" پس باطل وہ مال ہے جو کسی حقیقی شے کے مقابلہ میں نہ ہو -

بلکہ اکل بالباطل کے یہ معنے خود قرآن کی بعض دوسری آیات سے بھی مفہوم ہوتے ہیں جیسے سورۃ البقرہ کی آیت ۱۸۸ جس میں رشوت لینے اور رشوت کے ذریعے دوسرے کا حق مارنے کو اکل بالباطل سے تعبیر کیا گیا ہے ، اور ظاہر ہے کہ جو جس سے رشوت لیتا ہے یا جو رشوت کے ذریعے دوسرے کا حق مارتا ہے اس کی طرف سے رشوت دینے والے کے لئے کوئی حقیقی عوض و بدل نہیں ہوتا ، اور نہ اُس کے لئے کوئی عوض و بدل ہوتا ہے جس کا حق مارا گیا - اور جیسے سورۃ التوبۃ کی آیت ۳۴ جس میں اُس مال کے لینے لئے کوئی اور کھانے کو اکل بالباطل فرمایا گیا ہے جو بعض احبار و رھبان یعنی علماء و مشائخ مکر و فریب کے ذریعے عام لوگوں سے لیتے ہیں ، ظاہر ہے کہ بعض مولوی اور پیر مکر و فریب وغیرہ کے ذریعے عام لوگوں سے جو مال وغیرہ وصول کرتے ہیں اُس

کے عوض اُن کی طرف سے عوام کے لئے کوئی حقیقی بدل اور عوض موجود نہیں ہوتا جو انہیں اس مال کا حقدار قرار دیتا ہو لہذا وُہ دوسروں کا مال ناحق کھاتے ہیں۔

اسی طرح جو شخص سود، قمار، رشوت، چوری، غصب، خیانت اور دھوکہ دہی کے ذریعے دوسرے کا مال لیتا اور کھاتا ہے چونکہ ان طریقوں میں بھی اُس کی طرف سے دوسرے کے لئے اُس کے مال کا کوئی حقیقی بدل اور عوض موجود نہیں ہوتا نہ مادی اشیاء کی شکل میں اور نہ محنت و خدمت کی شکل میں جو اُسنے اُس لئے ہوئے مال کا حقدار ٹھہراتا ہو لہذا یہ طریقے بھی باطل کی تعریف میں آتے ہیں، بہت سے مفسرین حضرات نے اِن طریقوں کا باطل کی تفسیر اور توضیح میں ذکر کیا ہے لیکن یہ نہیں بتلایا کہ یہ کیسے باطل کے تحت آتے ہیں اور ان کے باطل ہونے کی وجہ کیا ہے۔

اکل بالباطل اور باطل طریقوں کی جو تفسیر و تشریح پیش کی گئی ہے اُس کی روشنی میں معاملہ زیر بحث کا جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ معاملہ بھی باطل معاملات میں داخل ہے کیونکہ اس میں شراکتی کھاتہ دار کے لئے اُس کے اصل سرمائے پر جو زائد مال طے کیا گیا ہے وہ بغیر کسی عوض و بدل کے ہے، کھاتہ دار کی طرف سے نہ اس کا بدل اور عوض کسی مادی شے کی شکل میں ہے اور نہ محنت و خدمت کی شکل میں، لہذا وہ جو کچھ بھی زائد لیتا ہے اپنا حق نہیں دوسرے کا حق لیتا ہے جس کا دوسرا نام اکل بالباطل ہے۔

یہاں اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اکل بالباطل اور باطل طریقوں کا جو مفہوم و مطلب بتلایا گیا ہے اس کے مطابق معاملہ مضاربت بھی جائز نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس میں بصورت نفع، سرمائے والے فریق کو اپنے اصل سرمائے پر جو زائد ملتا ہے اُس کے عوض اس کی طرف سے نہ کوئی مادی شے ہوتی ہے اور نہ محنت و خدمت، حالانکہ معاملہ مضاربت کو بالاتفاق جائز مانا گیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ معاملۂ مضاربت کے جائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں سرمائے والا فریق یہ طے کرتا ہے کہ اگر تجارت میں

نقصان ہوگا تو وہ نقصان پورے کا پورا وہ خود برداشت کرے گا ، کام کرنے والا فریق اس میں بالکل شریک نہ ہوگا جبکہ عموماً نقصان و خسارہ کام کرنے والے کی نا تجربہ کاری نا سمجھی اور غفلت وکوتاہی کی وجہ سے ہوا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سرمائے والا فریق ، کام کرنے والے فریق کے لئے ایک طرح کا مالی ایثار کرتا ہے جو گو بالفعل نہ سہی لیکن بالقوہ ضرور ہوتا ہے لہذا یہ ایثار اس زائد مال کا بدل اور عوض بن جاتا ہے جو نفع کی صورت میں سرمائے والے فریق کو بطور ایک نسبتی حصہ کے ملتا ہے ، لیکن چونکہ یہ عوض اس طرح کا نہیں جس طرح کا بیع و شراء اور محنت و نوکری میں ہوتا ہے لہذا معاملۂ مضاربت کے جواز کی بھی وہ حیثیت نہیں جو معاملۂ بیع و شراء اور معاملۂ محنت و خدمت کے جواز کی ہے ، علماء اصول الفقہ نے جواز کے دو معنے لکھے ہیں ایک جواز بمعنے عدم حرام جس سے کراہیت کی نفی نہیں ہوتی ، اس معنے کے لحاظ سے کسی چیز کے جائز ہونے کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ حرام نہیں لیکن مکروہ ہو سکتی ہے ، اور دوسرا جواز بمعنے وجوب و استحباب ، اس معنے کے لحاظ سے کسی چیز کے جائز ہونے کا مطلب ہوتا ہے وہ واجب یا مستحب ہے ، معاملۂ مضاربت کا جواز پہلی قسم کا ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ معاملہ حرام نہیں ، جبکہ معاملہ بیع و شراء اور معاملہ محنت و مزدوری کا جواز دوسری قسم کا ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ معاملے مستحب و مندوب ہیں کیونکہ ان میں انسان کو زحمت و تکلیف اٹھانی پڑتی ہے اور وہ اپنی محنت کا پھل کھاتا ہے جس کو احادیث میں انسان کی بہترین اور پاکیزہ ترین کمائی بتلایا گیا اور جس پر اجر و ثواب کا وعدہ ہے ۔

زیر بحث معاملے کو مضاربت پر اس لئے بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں سرمائے والے فریق کی طرف سے کام کرنے والے فریق کے لئے وہ ایثار موجود نہیں جو معاملۂ مضاربت میں ہے کیونکہ اس میں نقصان کی صورت میں کام کرنے والے کو بھی نقصان میں شریک ٹھہرایا گیا ہے ۔

اسی طرح یہ زیر بحث معاملہ ، عادلانہ اور منصفانہ معاملہ بھی نہیں اس لئے کہ اس میں اگرچہ دونوں فریق نفع و نقصان میں برابر کے شریک